© rasailojaraid.com

خود اپنے اختیار سے جاری کریں۔ وہ کبھی ان طریقوں کو جاری کرنے میں سچے دل سے تعاون نہیں کرسکتے اور نہ ان قوانین کی برضا و رغبت پیروی کرسکتے ہیں کہ جن کو وہ عقیدۂ باطل اور غلط سمجھتے ہیں۔ ان کے اندر آزادی کا جذبہ جس چیز نے بھڑکایا اور جس چیز کی خاطر انھوں نے جان و مال اور آبرو کی ناقابلِ تصور قربانیاں دیں وہ صرف یہ تھی کہ انھیں غیر اسلامی نظام زندگی کے تحت جینا گوارا نہ تھا اور وہ اسے اسلامی نظام زندگی سے بدلنا چاہتے تھے۔ اب ان سے یہ توقع کرنا بالکل بے جا ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد وہ بخوشی اس اصل مقصد ہی سے دست بردار ہو جائیں گے کہ جس کے لیے انھوں نے اتنی گراں قیمت پر آزادی خریدی ہے''۔

مولانا مودودی نے واضح کیا تھا کہ: ''اگر کوئی جابر طاقت زبردستی اس مقصد کے حصول میں مانع ہو جائے، اور ان پر اسلام کے سوا کوئی دوسرا ضابطۂ حیات مسلط کر دے تو وہ اسی مجبوری کے ساتھ اسے برداشت کرلیں کہ جس طرح انگریزی تسلط واقع ہونے کے بعد انھوں نے اسے برداشت کیا تھا۔ لیکن جو شخص یہ سمجھتا ہو کہ ایک نارضامند آبادی پر جبر سے ایک نظام مسلط کر کے اس کو کامیابی سے چلایا بھی جاسکتا ہے، تو وہ یقیناً سخت نادان ہے''۔

مولانا مودودی نے پاکستان میں قرآن و سنت پر مبنی اسلامی نظام حیات کے نفاذ کی مخالف بااثر قوتوں کی نشان دہی کرتے ہوئے چار طبقوں کی نشان دہی کی تھی:

- ''ایک وہ مسلمان جو اخلاق، تہذیب اور معاشرت میں اس حد تک مغربی رنگ اختیار کر چکے ہیں کہ اب انھیں اسلامی طرز زندگی کی طرف پلٹنے کے تصور ہی سے وحشت ہونے لگتی ہے۔
- ''دوسرے وہ مسلمان جو مسلمان ہونے سے تو منکر نہیں مگر مغربی افکار و نظریات سے اس حد تک متاثر ہو چکے ہیں کہ انھیں اب اسلام پر اعتقاد باقی نہیں رہا۔ یہ دونوں طبقے اپنے مخصوص رجحانات کے سبب ایک لادینی (سیکولر) نظام اختیار کرنے پر اصرار کرتے ہیں کیونکہ وہی ان کے مزاج و مذاق سے مناسبت رکھتا ہے۔
- ''تیسرا طبقہ ان مسلمانوں پر مشتمل ہے جو اسلامی نظام سے تو انکار نہیں کرتے مگر سنت کو چھوڑ کر صرف قرآن کو لینا چاہتے ہیں۔
- ''چوتھے طبقے میں پاکستان کی غیر مسلم اقلیتیں شامل ہیں جو مسلمانوں کے دینی نظام کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نسبت ایک غیر دینی نظام کو ترجیح دیتی ہیں۔

''ان میں سے پہلے تین طبقے مسلمانوں کی آبادی میں مجموعی طور پر ایک فی ہزار کی نسبت بھی نہیں رکھتے۔ اب یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ملک کا انتظام اس بنیاد پر تعمیر ہو نہ سکے جسے کروڑوں آدمی چاہتے ہیں اور اس بنیاد پر تعمیر ہو جسے چاہنے والے چند ہزار آدمیوں سے زیادہ نہیں''۔

مولانا نے اسلامی نظام حیات کے مخالفین کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا: ''ملک کی بھلائی ایسی ہی بنیادوں پر اس کا نظامِ زندگی تعمیر کرنے میں ہے، جن پر زیادہ سے زیادہ اتفاق ممکن ہو۔ اور یہ اتفاق بہر حال لادینی پر یا قرآن بلاسنت پر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا، آپ اپنے خیالات جو کچھ بھی ہیں رکھیں مگر مزاحمت چھوڑ دیں''۔

مولانا نے غیر مسلموں کو یقین دلایا تھا کہ: ''مسلمانوں کا مذہب آپ پر مسلط نہیں کیا جائے گا، اور آپ کے مذہب اور تہذیب میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ آپ کا پرسنل لا آپ کے لیے محفوظ رہے گا، اور آپ کو زندگی کے ہر شعبے میں یہاں عملاً اس سے زیادہ حقوق حاصل ہوں گے، جو دنیا میں کہیں اقلیتوں کو حاصل ہوتے ہیں''۔

● **جمہوریت کا فروغ:** اسلامی نظام حکومت کے قیام کے لیے مولانا صرف جمہوری طریقۂ کار کو اپنانے کے حق میں تھے۔ ان کے نزدیک: ''یہ خود قرآن وسنت کا منشا بھی ہے اور باشندگانِ ملک کی خواہشات کا تقاضا بھی''۔ مولانا کی دلیل یہ تھی کہ: ''یہ ملک کسی خاص شخص یا طبقے اور گروہ کا نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کا ہے جو اس میں رہتے ہیں۔ لہٰذا، اس کا انتظام ان سب کی، یا کم از کم ان کی اکثریت کی مرضی کے مطابق چلنا چاہیے اور ان کو اصولاً یہ حق اور عملاً یہ موقع حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اپنے حکمران اپنی آزاد مرضی سے چنیں اور اپنی آزاد مرضی ہی سے ان کو تبدیل کرسکیں''۔ ان کو اس بات کا پوری طرح ادراک تھا کہ جمہوریت کی دنیا میں جو مختلف شکلیں پائی جاتی ہیں اس کے باعث اس نظام کی موزونیت اور افادیت پر سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ اس امر کو سامنے رکھتے ہوئے ان کا زور اس بات پر تھا کہ: ''بحث اس [جمہوریت] کی کسی خاص شکل میں نہیں بلکہ اس امر میں ہے کہ جو شکل بھی یہاں اختیار کی جاتی ہے، اس میں جمہوریت کی یہ حقیقت فی الواقع موجود ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر یہاں کوئی ایسا نظام قائم کردیا جائے کہ جس میں باشندگان ملک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو نہیں بلکہ کسی خاص طبقے کی مرضی کو غلبہ حاصل ہو تو خواہ اس پر کتنے ہی جلی حروف میں ’جمہوریت‘ کا سرعنوان لکھ دیا جائے، اس پر عام لوگوں کا مطمئن ہونا اور مطمئن رہنا بہر حال ممکن نہیں‘‘۔ جمہوریت کے نام پر فردِ واحد یا کسی خاص گروہ کی بالادستی مولانا کے نزدیک: ’’ملک کی فلاح و بہبود کی ضامن نہیں ہوسکتی‘‘۔ وہ اس نقصان دہ صورتِ حال میں مبتلا ہونے سے ملک کو بچانا ضروری سمجھتے ہوئے تجویز کرتے ہیں: ’’وہ تمام لوگ جو ملک کے آئندہ نظام کی تشکیل پر اثر انداز ہوسکتے ہیں، پہلے جمہوریت کے اصول کو صدقِ دل سے قبول کرلیں اور پھر نیک نیتی کے ساتھ ایسا نظام بنائیں، جس میں یہ اصول [اصل جمہوری روح] ٹھیک ٹھیک کارفرما ہو‘‘۔

مولانا کو اس بات کا پوری طرح اِدراک تھا کہ: ’’جمہوریت میں بھی بہت سے نقائص ہوتے ہیں، اور وہ نقائص اس وقت بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں جب کسی ملک کی آبادی میں شعور کی کمی ہو، ذہنی انتشار موجود ہو، اخلاق کمزور ہوں اور ایسے عناصر کا زور ہو جو ملک کے مجموعی مفاد کی نسبت اپنے ذاتی، نسلی، صوبائی اور گروہی مفاد کو عزیز رکھتے ہوں‘‘۔ لیکن جمہوریت کے حق میں مولانا کی دلیل یہ تھی کہ: ’’ان سب حقائق تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ عظیم تر حقیقت اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے کہ ایک قوم کی ان کمزوریوں کو دور کرنے اور بحیثیت مجموعی ایک بالغ قوم بنانے کا راستہ جمہوریت ہی ہے‘‘۔ جمہوریت کے حق میں اپنی رائے کی مزید تشریح کرتے ہوئے مولانا نے باور کرایا ہے: ’’جمہوری نظام ہی وہ ایک نظام ہے جو ایک ایک شخص میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ ملک اس کا ہے، ملک کی بھلائی اور برائی اس کی اپنی بھلائی اور برائی ہے۔ یہی چیز افراد میں اجتماعی شعور بیدار کرتی ہے۔ اور اس سے فرداً فرداً لوگوں کے اندر اپنے ملک کے معاملات سے دل چسپی پیدا ہوتی ہے۔ جمہوریت تو نام ہی اس چیز کا ہے کہ عام لوگ خود اپنے قومی اور ملکی معاملات کو چلانے کے ذمہ دار ہوں اور وہ تجربے سے سبق سیکھ سیکھ کر اپنی غلطیوں کی تلافی کرتے چلے جائیں، یعنی ایک یا چند مرتبہ اگر ان کا انتخاب غلط ثابت ہوا اور اس کے نقصانات ان کے سامنے آجائیں تو کوئی دوسرا مداخلت کر کے اس کی اصلاح کرنے نہ آئے بلکہ وہ خود ہی ایک معروف و مسلّم ضابطے کے مطابق اس کی اصلاح کرتے رہیں‘‘۔ جمہوریت کے مقابلے میں دوسرے نظاموں (بادشاہی، ڈکٹیٹرشپ، اشرافیت) پر تنقید کرتے ہوئے مولانا نے لکھا تھا: ’’اس میں عوام الناس، حالات کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محض تماشائی بن کر رہتے ہیں اور جب ان حالات کے ردوبدل یا بناؤ اور بگاڑ میں ان کی رائے اور مرضی کا دخل نہیں ہوتا، تو وہ ان میں دل چسپی بھی لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ جمہوریت کے جو اور جیسے بھی نقائص ہوں، انھیں اس نقصان عظیم سے بہرحال کوئی نسبت نہیں ہے''۔

مولانا مودودی نے ان لوگوں پر سخت گرفت کی تھی جو یہ کہتے ہیں کہ: ''یہاں [پاکستان میں] جمہوریت ناکام ہو چکی ہے اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اس ملک کے باشندے اس کے اہل نہیں ہیں۔ یہ حضرات وقتاً فوقتاً اس کے لیے مختلف قسم کی متبادل صورتیں پیش کرتے رہتے ہیں''۔ مولانا کا کہنا تھا: ''وہ متبادل صورتیں جو جمہوری نظام کے مقابلے میں پیش کی جاتی ہیں، ان کے بارے میں یہ بات ہم کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جمہوریت درہم برہم کر کے آمریت کی راہ پر چل پڑنا جتنا آسان ہے، جمہوریت کی طرف پھر پلٹ آنا اتنا آسان نہیں ہے۔ آمریت خواہ پُرامن طریقے سے ہی قائم ہو، بہرحال پُرامن طریقے سے دفع نہیں ہوسکتی''۔ آمریت پر کڑی تنقید کرتے ہوئے مولانا نے اس کے معکوس نتائج کو بڑی تفصیل سے واضح کیا تھا: ''آمریت خواہ کتنی ہی خیراندیش ہو اور کیسی ہی نیک نیتی سے قائم کی جائے، اس کا مزاج اس کے اندر لازماً چند خصوصیات پیدا کر دیتا ہے، جو اس سے کبھی دُور نہیں ہوسکتیں اور ان خصوصیات کے چند لازمی اثرات ہوتے ہیں جو مرتب ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ وہ تنقید کو برداشت نہیں کرتی۔ وہ خوشامد پسند ہوتی ہے۔ وہ اپنے محاسن کا اشتہار دیتی اور عیوب پر پردہ ڈالتی ہے۔ اس میں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ خرابیاں بروقت نمایاں ہوجائیں اور ان کا تدارک کیا جاسکے۔ وہ رائے عامہ اور افکار اور نظریات سے غیر متاثر ہوتی ہے۔ اس میں ردوبدل کسی کھلے کھلے طریقے سے نہیں بلکہ محلاتی سازشوں اور جوڑ توڑ سے ہوتا ہے، جنھیں عوام الناس صرف تماشائی ہونے کی حیثیت سے دیکھتے رہتے ہیں۔ اس میں صرف ایک محدود طبقہ ملک کے سارے دروبست پر متصرف ہوتا ہے، اور باقی سب بے بس محکوم بن کر رہتے ہیں۔ اس کا آغاز چاہے کیسی ہی نفع رسانی کے ساتھ ہو، انجام کار وہ ایک جابر طاقت بنے بغیر نہیں رہتی اور عام لوگ بے زار ہو کر اس سے خلاصی کی تدبیریں سوچنے لگتے ہیں، مگر خلاصی کے جتنے پُرامن راستے ہوتے ہیں یہ ان کو چُن چُن کر بند کر دیتی ہے، اور مجبوراً ملک ایسے انقلابات کی راہ پر چل پڑتا ہے، جو مشکل ہی سے اس کو کسی منزل خیر پر پہنچنے دیتے ہیں''۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا چاہتے تھے کہ: ''پاکستان میں جمہوری نظام کے بارے میں ہمیں یکسو ہونا چاہیے'' لیکن وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ: ''ہم جمہوریت کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ اختیار کریں اور اس میں آمریت کے لوازم اور خصائص کی آمیزش نہ کریں، کیوں کہ اس کے بغیر جمہوریت صحیح طریقے سے کام نہیں کرسکتی اور نہ وہ نتائج دکھا سکتی ہے، جو اس سے مطلوب ہیں''۔

پاکستان میں حقیقی جمہوریت کے قیام اور استحکام کے لیے مولانا نے پانچ اصول پیش کیے:

۱- تقسیم اختیارات کا اصول، یعنی ریاست کے تینوں شعبوں انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ کے دائرۂ اختیار کا واضح طور پر الگ ہونا۔

۲- شہری آزادیوں اور بنیادی حقوق کی ضمانت اور عدلیہ کا ان کے تحفظ پر قادر ہونا۔

۳- انتخابات کی آزادی اور اس کی حفاظت کے لیے ایسی قانونی وانتظامی تدابیر، جن سے یہ اطمینان ہو سکے کہ انتخابات کے نتائج فی الحقیقت راے عام کے مطابق نکل سکیں گے۔

۴- قانون کی حکمرانی، یعنی یہ امر کہ راعی اور رعایا کے لیے ایک ہی قانون ہو، اور سب اس کے پابند ہوں، اور عدالتوں کو یہ حق ہو کہ سب پر بے لاگ طریقے سے وہ اس کو نافذ کرسکیں۔

۵- ملازمین حکومت کا خواہ وہ سول سروس سے تعلق رکھتے ہوں یا فوج سے، سیاست میں دخیل نہ ہونا اور اس ہیئتِ حاکمہ کی اطاعت قبول کرنا کہ جسے باشندوں کی اکثریت آئینی طریقے پر ملک کا اقتدار سونپ دے''۔

● **آمریت کی نفی:** جمہوریت کی بقا کے لیے مولانا مودودی نے اس بات پر زور دیا تھا:

''حکمرانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہونا چاہیے کہ وہ جب چاہیں لوگوں کی آزادیِ ذات، آزادیِ تحریر وتقریر، آزادیِ اجتماع اور آزادیِ نقل وحرکت سلب کرلیں۔ جمہوریت کبھی ایسے ماحول میں زندہ نہیں رہ سکتی، جہاں حکومت پر تنقید کرنا دشوار، اور حکمرانوں کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنا دشوار تر ہو جائے۔ ایسی جگہ تو جو ایک دفعہ برسرِ اقتدار آجائے گا، وہ پھر زبردستی اقتدار پر قابض رہے گا اور اس کا نام بہرحال جمہوریت نہیں ہے''۔

جمہوریت میں آزادی کے ساتھ انتخاب کی آزادی پر مولانا نے بہت زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک: ''جمہوریت تو نام ہی اس چیز کا ہے کہ لوگ اپنی آزاد مرضی سے جس کو چاہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حکمرانی کے لیے منتخب کریں اور جب چاہیں اپنی آزاد مرضی سے ان کو تبدیل کر دیں۔ اگر دباؤ اور لالچ اور فریب اور حیلوں سے انتخابات کے نتائج اصلی راے عام کے بالکل برعکس برآمد کیے جاسکتے ہوں تو ایسی حالت میں لوگوں کو راے اور انتخاب کا حق دینا اور نہ دینا دونوں برابر ہیں۔

● **آئین اور قانون کی حکمرانی:** جمہوری نظام کی کامیابی کو مولانا نے آئین اور قانون کی سب کے لیے یکساں حکمرانی کو بنیادی شرط قرار دیا تھا: ''ملک میں آئین و قانون اور ضابطہ سب کے لیے یکساں ہو، سب پر غالب ہو اور کوئی اس کی خلاف ورزی کرنے کا مجاز نہ ہو۔ جہاں قانون کی ساری پابندیاں صرف کمزوروں کے لیے ہوں اور طاقت والے ہر وقت آئین اور قانون کو بالاے طاق رکھ کر اپنی من مانی کر سکتے ہوں اور جہاں عدل و انصاف کی طاقت زور آوروں کے مقابلے میں قانون کو نافذ کرنے سے عاجز ہو، وہاں جمہوریت کبھی قائم نہیں ہوسکتی اور قائم ہو جائے تو زندہ نہیں رہ سکتی۔ جمہوریت تو سب لوگوں کی برابری کا نام ہے اور برابری کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ضابطہ سب کے لیے ایک ہو اور سب پر یکساں نافذ ہو''۔

سیاست میں مقتدر اور محافظ حلقوں کی مداخلت کو مولانا مودودی نے سخت ناپسند کرتے ہوئے اس عمل کو ایک بہت بڑی خیانت اور نتائج کے اعتبار سے پاکستان کے لیے ایک خطرناک چیز قرار دیا تھا۔ انھوں نے حکومت کے کارپرداز اور محافظوں کو سچے دل سے جمہوریت کے اصول کو تسلیم کرنے کی یاددہانی کراتے ہوئے کہا تھا کہ: ''وہ اس بات کو مان لیں کہ ملک باشندوں کا ہے اور باشندوں کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی آزاد مرضی سے جن لوگوں کو چاہیں اپنے ملک کا کارفرما بنائیں''۔

مولانا مودودی کا نظریہ تھا کہ: ''ہمارے ملک کو بہت سے درپیش مسائل کی طرف توجہ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ لوگوں کی اخلاقی و دینی حالت درست کرنی ہے۔ معاشی بدحالی کا علاج کرنا ہے۔ عام جہالت کو دُور کرنا ہے۔ نظام تعلیم کی اصلاح کرنی ہے اور ایسے ہی بہت سے مسائل ہیں''۔ لیکن ان کے نزدیک سب سے مقدم بات یہ تھی کہ: ''ہم اپنے نظام زندگی کی بنیادوں پر اتفاق کرلیں اور یہ اتفاق صحیح بنیادوں پر ہو''۔ مولانا مودودی کو یقین تھا کہ ہم سب اسی لائحہ عمل کے تحت اپنے مسائل کو حل کرنے کی طرف قدم بڑھا سکیں گے اور ایک مستحکم پاکستان تعمیر کرسکیں گے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عمل کا شوق اور قبولیت کی آرزو

ڈاکٹر محی الدین غازی

انسانی تاریخ کے حسین ترین مناظر میں ایک منظر وہ ہے جب بوڑھے ابراہیم علیہ السلام اور نوجوان اسماعیل علیہ السلام مل کر اللہ کے گھر کی تعمیر کر رہے تھے۔ اس وقت ان کے لبوں پر بڑی پیاری دعائیں جاری تھیں، جو زمین سے آسمان تک ہر شاہراہ کو معطر کیے ہوئی تھیں۔ ایمان و یقین سے روشن ان دعاؤں میں پہلی اور بہت پیاری دعا یہ تھی:

ہمارے ربّ ہم سے قبول فرمالے، بلاشبہہ تو سننے اور جاننے والا ہے (رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ)

تصور میں دیکھیں اور سوچیں اللہ کے دو عظیم پیغمبر بڑی آزمایشوں اور عظیم قربانیوں سے سرخ رو ہو جانے کے بعد اللہ کے پہلے گھر کی تعمیر میں مصروف ہیں، اور اس وقت بھی سب سے زیادہ یہ فکر دامن گیر ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں ان کا یہ کام قبول ہو جائے۔ یہ کیسی روح پرور کیفیت ہے اور اس میں اچھے کام کرنے والوں کے لیے کیسی گہری نصیحت ہے۔ جب رحمان کے خلیل کو رحمٰن کے گھر کی تعمیر جیسے عظیم کام کے قبول ہونے کی اتنی زیادہ فکر ہے تو عام انسانوں کو دین کے چھوٹے بڑے سب کام کرتے ہوئے قبولیت کی کتنی زیادہ فکر رہنی چاہیے۔

قبولیت کی سچی طلب دل میں بس جاتی ہے تو تمام کام اخلاص کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ قبولیت کی فکر تقاضا کرتی ہے کہ کام کا مقصود صرف اللہ کی رضا ہو اور اس میں کسی کے لیے کوئی حصّہ نہیں ہو۔ سوشل میڈیا کے اس زمانے میں، جب کہ ہر شخص کے لیے اپنی کارکردگی کی خبر عام کرنا آسان ہو گیا ہے، اخلاص کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ برائی اس میں نہیں ہے کہ آپ کا کام خبر بن جائے، لیکن برائی اس میں ضرور ہے کہ خبر بنانا ہی کام کا مقصد بن جائے، اور اس طرح پستی کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرف رخ ہونے کی وجہ سے کام کی خبر آسمان پر جانے کے بجائے زمین کی پستیوں میں ہی بکھر کر رہ جائے۔ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے اخلاص کے ساتھ صرف اللہ کے یہاں قبول ہوجانے کے لیے تعمیر کعبہ کا کام کیا اور اللہ نے اسے قیامت تک کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی خبر بنا دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی رضا کے لیے جو کام کیا جائے وہ کائنات کی بہت خاص خبر بن جاتا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ کام خبر بننے کے لیے نہیں بلکہ رب خبیر کے یہاں قبول ہونے کے لیے کیا جائے۔

قبولیت کی سچی طلب دل میں بس جاتی ہے، تو اچھے کام کرتے ہوئے دل میں یہ جذبہ جوان رہتا ہے کہ مشکل سے مشکل کام میرے حصے میں آجائے۔ ٹیم میں کچھ لوگ جسمانی طور سے کمزور ہوسکتے ہیں، کچھ کی قوت کار کم ہوسکتی ہے، اور کچھ کی مدت کار تھوڑی ہوسکتی ہے، ایسے میں پوری ٹیم کو قوت ان سے ملتی ہے جو بڑے بڑے بوجھ اٹھانے کے لیے خود کو پیش کرتے ہیں، جنھیں آرام سے بے رغبتی اور کام کا جنون ہوتا ہے، جنھیں مال غنیمت کا شوق نہیں ہوتا ہے بلکہ جامِ شہادت سے عشق ہوتا ہے۔ قبیلہ نخع کے لوگ قادسیہ کے معرکے میں شریک ہوئے اور دوسروں کے مقابلے میں زیادہ کام آگئے۔ حضرت عمرؓ نے خبر لانے والوں سے پوچھا، نخع کے لوگ کیوں زیادہ شہید ہوئے؟ کیا دوسرے انھیں محاذ پر تنہا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے؟ انھوں نے وضاحت کی: دراصل ہوا یہ کہ نخع والوں نے اہم ترین محاذ آگے بڑھ کر تنہا خود سنبھال لیے تھے (اِنَّ النَّخعَ وَلَّوْا أَعْظَمَ الْأَمْرَ وَحْدَهُمْ) (الاصابہ فی تمیز الصحابہ، ج۱، ص ۱۹۶)۔ جو مشکل کام اپنے ذمے لیتا ہے، اسی کو تکان زیادہ ہوتی ہے، پسینہ بھی اسی کا زیادہ بہتا ہے، چوٹیں بھی اسے ہی زیادہ آتی ہیں، لیکن وہی پوری ٹیم کے لیے جوش اور طاقت کا سرچشمہ ہوتا ہے، اسی کو دیکھ کر دوسروں کو کام کرنے کا حوصلہ اور توانائی ملتی ہے۔

قبولیت کی سچی طلب ہوتی ہے، تو آدمی شہرت اور ناموری سے بہت اوپر اُٹھ جاتا ہے۔ اسے اس کی فکر نہیں ہوتی کہ اخبار میں اس کا فوٹو نہیں چھپا، لوگوں کو اس کے کارنامے معلوم نہیں ہوئے، اسے انعام واسناد سے نوازا نہیں گیا، فکر تو اسے بس یہ رہتی ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں وہ مقبول قرار پاجائے۔ اور یہی تو اصل کامیابی ہے۔ اس عظیم کامیابی کے سامنے کسی اعتراف اور کسی انعام کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک معرکے کے بعد قاصد خبر لے کر حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ نے پوچھا معرکے میں کون کون کام آ گیا؟ اس نے کچھ خاص خاص لوگوں کے نام بتائے، پھر کہا کچھ اور لوگ بھی کام آ گئے جنھیں امیر المومنین نہیں جانتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ رونے لگے، اور کہنے لگے: امیر المومنین انھیں نہیں جانتا تو اس میں ان کا کیا نقصان ہے، اللہ تو انھیں جانتا ہے، اس نے تو انھیں شہادت کے اونچے مقام پر فائز کر دیا ہے، اور عمر کے جان لینے سے ان کا کیا بھلا ہوگا۔ (وَمَا ضَرَّهُمْ أَلَّا يَعْرِفَهُمْ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ! لَكِنَّ اللّٰهَ يَعْرِفُهُمْ وَقَدْ أَكْرَمَهُمْ بِالشَّهَادَةِ، وَمَا يَصْنَعُونَ بِمَعْرِفَةِ عُمَرَ) (البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر، ج ۷، ص ۱۲۶)۔ جو اللہ کی قدر پہچانتے ہیں، وہ اسی کو کافی سمجھتے ہیں اور اسی کو ضروری بھی سمجھتے ہیں کہ اللہ ان کے عمل کو قبول کر لے۔

قبولیت کی سچی طلب ہوتی ہے تو کام کا معیار بلند رکھنے کا شوق بھی بڑھ جاتا ہے۔ قبولیت کی طلب کام کے حسن پر ذرا سی بھی آنچ آنا گوارا نہیں کرتی۔ اسے پورا یقین ہوتا ہے کہ جب اللہ کی بارگاہ میں قبولیت کے لیے کام کیا جائے تو کام بھی شایانِ شان ہونا چاہیے اور اس کے دامن پر ذرا سا بھی داغ نہیں لگنا چاہیے۔ ایک بدو سے جب زکوٰۃ وصول کرنے والے نے اس کے تمام اونٹوں کو شمار کر کے ایک سال کا اونٹنی کا بچہ مانگا، تو اس نے کہا اللہ کے راستے میں اس سے کیا ہوگا، نہ دودھ دے، نہ سواری کے کام آئے، پانچ سال کی تیار اور تنومند اونٹنی لے کر جاؤ۔ شعور اور ذوق کی اس بلندی پر پہنچنے کے لیے بس یہ جذبہ کافی ہوتا ہے کہ میرا مقصود اللہ ہے، اسی کے سامنے اعمال کو پیش ہونا ہے، اس لیے میرا ہر عمل اونچی شان والا ہونا چاہیے۔

قبولیت کی سچی طلب ہر اچھے کام کو تکمیل تک پہنچانے کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ یہ طلب اس وقت بے مثال تازگی عطا کرتی ہے، جب تھکن کی شدت سے جسم چور ہو جاتا ہے اور حوصلے جواب دینے لگتے ہیں۔ دل میں شیطان وسوسہ ڈالتا ہے کہ تم اتنے ہی کے مکلف تھے، اب باقی کام کوئی اور کرلے گا یا کسی دوسرے وقت ہو جائے گا۔ لیکن جب قبولیت کی جستجو انگڑائی لیتی ہے تو حوصلوں کو جلا مل جاتی ہے اور جسم کو نئی توانائی حاصل ہو جاتی ہے۔ جب یہ دھن سوار ہو کہ اللہ کی بارگاہ میں یہ کام قبول ہو جائے تو پھر اس کام کو ادھورا کب کے لیے اور کس کے لیے چھوڑا جائے۔

اللہ کی عظمت پر ایمان رکھنے والے اچھے کاموں کو قابلِ قبول بنانے کی ہر کوشش کرتے ہیں، اور ان کے قبول ہو جانے کی دُعا کرتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آؤ پھر سے کریں تخلیق اک نئی تاریخ

ابن سینا (980-1037 C.E)

بابائے طب

عظیم مسلمان عالم جنھوں نے دسویں صدی میں پہلی مرتبہ
مہلک بیماری گردن توڑ بخار کو مفصل انداز میں بیان کیا

جابر بن حیان (وفات 803 C.E)

ماہر کیمیا

لفظ کیمسٹری عربی لفظ الکیمیا سے اخذ کیا گیا ہے جو کہ شعبۂ کیمیا میں
عرب عالموں کی وسیع تحقیق اور مطالعہ کا اعتراف ہے

ابوالقاسم الزہروی (936-ad-1037-AD سپین)

عظیم ترین جراح

آج بھی جدید آلات جراحی میں سے اکثر آلات دسویں صدی کے
مسلمان جراح (سرجن) الزہروی کے تخلیق کردہ
ڈیزائن کے عین مطابق ہیں

ہمیں یقین ہے کہ ہمارے نوجوان اپنی قابلیت وصلاحیت کی بنیاد
پر سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں نمایاں ترین مقام حاصل کرسکتے ہیں

اسلامک انٹرنیشنل میڈیکل کالج

المیزان IIMCT کمپلکس، 274۔ پشاور روڈ، راولپنڈی | یواے این: 051-111-510-510، ایکسٹینشن: 226,227

RIPHAH INTERNATIONAL UNIVERSITY

051-111-510-510 | www.riphah.edu.pk | admissions@riphah.edu.pk | Tune into Riphah FM 102.2

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن کریم کا طرزِ استدلال اور عصرِ حاضر

ہلال احمد تانترے

دورِ جدید کی برق رفتار ترقی کے پیچھے انسان کی غور و فکر اور سوچ بچار کی صلاحیتوں کا ہاتھ ہے۔ سوچ بچار ایک ایسا انسانی عمل ہے، جس سے انسان آس پاس کی چیزوں کا مشاہدہ کر کے نئی نئی حقیقتوں سے پردہ اٹھاتا ہے۔ لیکن سوچنا اگر محض برائے سوچ ہو تو وہ سوچ کسی کام کی نہیں۔ سوچنے کے بعد انسان جو خیال یا نقطۂ نظر پیش کرتا ہے اس کا کسی دلیل سے ثابت ہونا ازبس ضروری ہے۔ اگر وہ کوئی دلیل پیش کرنے سے قاصر رہے تو اُس نقطۂ نظر کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ دلیل پیش کرنے کے بعد دلیل کا صحت مند اور پیش کردہ نکتے کے ساتھ موافق ہونا بھی لازمی ہے، ورنہ پیش کردہ نقطۂ نظر بذاتِ خود غلط ثابت ہوگا۔

غور و فکر کا قرآنی تصور

سوچنے کی صلاحیت خالصتاً مخلوقِ انسانی کو بخشی گئی ہے۔ اس طرح سے انسان کا سوچنا اُسے انسانیت کے اعلیٰ مرتبے پر فائز کر دیتا ہے۔ لیکن یہاں بھی ایک استثنا ہے، اگر انسان کی سوچ محض سوچ ہی تک محدود ہو اور وہاں سے وہ کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر رہے، تو ایسی سوچ کا کوئی ماحصل ہی نہیں۔ سورۂ آل عمران میں عقل اور اِس سے اخذ کردہ نتائج کے مابین اس طرح سے ربط قائم کیا گیا ہے کہ: ''زمین اور آسمان کی پیدایش میں، رات اور دن کے باری باری سے آنے میں عقل مند لوگوں کے لیے بہت ساری نشانیاں ہیں'' (اٰل عمرٰن ۳:۱۹۰)۔ انسان کے پاس عقل ہونے کے باوجود اگر وہ اُسے استعمال میں لا کر صحیح نتائج برآمد نہ کر سکے اور اپنی زندگی کے جملہ معاملات اُن اخذ کردہ نتائج کے مطابق نہ سنوارے، تو ایسے انسان بھی پھر غیر انسانی مخلوقات کی طرح ہوتے ہیں،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرق بس اتنا ہوتا ہے کہ یہ انسانی شکل میں ہوتے ہیں اور وہ غیر انسانی اشکال میں۔ اِن ہی اشخاص کو قرآن کریم نے یہ کہہ کر پکارا ہے کہ: ''اِن کے پاس محسوس کرنے کے لیے دل تو ہوتے ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں، ان کے پاس دیکھنے کے لیے آنکھیں تو ہوتی ہیں مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں، اُن کے پاس سننے کے لیے کان تو ہوتے ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گئے گزرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوگئے ہیں'' ۔(الاعراف ۷:۱۷۹)

ایک دوسری جگہ ایسے انسانوں کو بدترین جانوروں سے تشبیہ دی گئی ہے، جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ عقلِ سلیم کو استعمال کرنے کی ہدایات اس حد تک قرآن کریم میں بیان کی گئی ہیں کہ ایک تو اس نعمتِ عظمیٰ کا آخرت کے دن حساب دینا ہوگا: ''جب کہ انسان سے آنکھ، کان اور دل سب ہی کی باز پُرس ہونی ہے'' (بنی اسرائیل ۱۷:۳۶)۔ دوسری طرف اسے استعمال نہ کرنے پر اللہ تعالیٰ کی وعید سناتے ہوئے متنبہ کیا گیا ہے کہ: ''جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے اُن پر ہم گندگی ڈال دیتے ہیں'' ۔(یونس ۱۰:۱۰۰)

قرآن کا طرزِ تفہیم

قرآن پاک نے جس اندازِ فہمایش کو پسند و پیش کیا ہے، اُس کا سب سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ انسانی عقل کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اُسے کوئی نکتہ سمجھانے میں کسی زور زبردستی یا دھونس دباؤ سے کام نہ لیا جائے۔ جیسا کہ فرمایا گیا: ''دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں'' (البقرہ ۲:۲۵۶)۔ اُس کی عقل کی آزادی کی سطح کو سمجھنے کے بعد اُسے اُسی کی فہمایش کے مطابق بات سمجھائی جائے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مختلف الفکر انسان دین سیکھنے کے لیے آتے تھے اور سوالات پوچھتے، لیکن آپؐ ہر کسی کو دین کے متعلق ایک ہی جواب نہیں دیتے۔ قریبی صحابہ سے اندازِ بیان طویل، جامع اور موقع و محل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہوتا تھا، وہیں کسی بدوی صحابیؓ کے سوال کے جواب کا طرزِ تفہیم بہت ہی سادہ اور مختصر ہوتا تھا۔ اسی چیز کو قرآن پاک نے اس انداز میں پیش کیا ہے کہ: ''اے نبیؐ، اپنے رب کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو'' (النحل ۱۶:۱۲۵)۔ یہ آیت موجودہ دور کے اُن مناظرہ پسند حضرات اور سوشل میڈیا پر بیٹھے جذباتی نوجوانوں کے لیے بھی ایک اہم ذریعۂ رہنمائی ہے جو اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرزِ بیان میں بہت ہی شدت پسند ہیں اور جو اپنی بات کو 'منوانے' میں گالم گلوچ کا استعمال کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ غور کرنے کے لائق یہ مقام ہے کہ یہ آیت مشرکین، یہود، نصاریٰ و کفّار کے ساتھ بات یا مجادلہ کرنے کے تناظر میں نازل ہوئی ہے کہ اُن سے بھی اخلاقی حدود میں ہی بات کرنی ہے، لیکن کیا ہوا ہے کہ موجودہ دور میں مسلمان اپنے فروعی مسئلوں کے اندر اس حد تک متعصب ہوگئے ہیں اور اپنی بات کو منوانے میں اتنی شدت اختیار کرتے ہیں جہاں اخلاقی حدود و قرآنی احکام کا پاس و لحاظ ہی نہیں رکھا جاتا ہے۔

سوچ بچار کی موجودہ صورت حال

موجودہ دنیا کی جنگیں افکار و نظریات کی بنیادوں پر لڑی جا رہی ہیں۔ ان جنگوں میں جو کوئی بھی اپنی بات کو سچ ثابت کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، وہی بازی اپنے نام کر لیتا ہے، قطع نظر اس کے کہ بات کو سچ ثابت کرنے میں کن 'ناروا اصولوں' کو بروئے کار لایا گیا ہو۔ اس طرح کی جنگیں آج کل عام طور پر ٹی وی، اخبارات و دیگر نشر و اشاعتی اداروں، خاص کر سوشل میڈیا کے ایوانوں کے اندر لڑی جا رہی ہیں۔ دو مختلف نظریات کے حامل اشخاص ایک دوسرے سے بحث صرف اور صرف اس لیے کر رہے ہوتے ہیں کہ کون صحیح ہے اور کون غلط، نہ کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ یہی وہ بنیادی سبب ہے کہ جس سے سماج میں نفرتوں و عداوتوں کا بازار گرم ہوتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آپس کے بحث و مباحثہ سے یہ پتا لگایا جائے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا، لیکن جس طرح صحیح کہنے والا اپنے نقطۂ نظر کو سچ ثابت کرنے میں بہت شدت برتتا ہے، اُسی طرح غلط کہنے والا اپنی عزتِ نفس کو بچانے کی خاطر نت نئی دلیلیں پیش کرتا ہے۔ اپنی کج روی میں بدمست ہونا اور اپنے پیش کردہ نظریات سے اس حد تک محبت کرنا کہ انسان اندھا ہو جائے، انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ قرآن پاک کے اسلوب کی طرف نظر ڈال کر یہ بات بآسانی کہی جا سکتی ہے کہ عقل مند وہ لوگ ہیں جو اپنی غلطی کو غلطی مان کر بروقت رجوع کریں۔ ایسے انسانوں کے لیے ہی انعامات کی خوش خبری ہے، بلکہ اُن سے یہ کہہ کر خطاب کیا گیا ہے کہ جیسے اُنھوں نے وہ کام کیا ہی نہیں۔

حق شناسی کا اصول اور آثارِ اکابرین

انسانی عقل محدود ہے۔ اُس کے دماغ میں اِس کائنات کی حقیقت یک بارگی سے نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُتر سکتی، بلکہ یہ ایک ترتیب وار اور مسلسل عمل ہے۔ اس طرح سے جس وقت بھی انسان کے سامنے عقل کے نئے دریچے کھل جائیں اور وہ جان جائے کہ اس کا وقتِ حاضر سے پہلے پیش کردہ نظریہ غلط ثابت ہورہا ہے، تو اُسے اپنی پچھلی رائے سے رجوع کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ مسلمانوں کے اندر فکری انحطاط کی بنیادی وجہ یہی رہی ہے کہ ہر کوئی اپنی رائے کو سچ ثابت کرنے پر تُلا ہوا ہے اور کوئی بھی اپنی غلطی کو غلطی مان کر رجوع نہیں کر رہا ہے، بلکہ اُلٹا ہدایات والی آیات و آثار سے گمراہی مول لی جاتی ہے۔ جیسے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ منکرین تقدیر سے فرمایا کرتے تھے کہ اے قدریہ کے گروہ! جن آیات سے صحابہ کرامؓ تقدیر کو ثابت کیا کرتے تھے تم انھی آیات کو پیش کر کے تقدیر کا انکار کرتے ہو۔ اِس کے بالمقابل سائنس کی دنیا میں اگر ایک سائنس دان کوئی ایک رائے قائم کرلے اور کسی دوسرے محقق نے اُس رائے کو منطق کے اعتبار اور صحیح الاسناد دلائل سے غلط ثابت کیا، تو پہلے حضرت نے اپنی رائے سے (اگر حضرت زندہ نہ رہے تو اُس کے شاگردوں نے) رجوع کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا۔ اس معاملے میں مسلمانوں کے اکابرین بڑے ہی دریا دِل رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ کا اسمِ گرامی اس حوالے سے بڑے ذوق وشوق سے لیا جاسکتا ہے۔ چاہے وہ تجسس کرنے کے معاملے میں آپؓ کا اپنے طرزِ عمل سے رجوع کرنا ہو یا نبی اکرمؐ کے رحلت کے وقت حضرت ابوبکرؓ کی بات مان کر خاموشی اختیار کرنی ہو، یا حضرت حسان بن ثابتؓ کا مسجد نبویؐ کے باہر نعتیہ اشعار پڑھنے پر غصہ ظاہر کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت دلیل سننے کے بعد اجازت باقی رکھنا ہو۔ (بخاری، مسلم، ترمذی، مکارم الاخلاق)

یاد رہے یہ وہ عمرؓ ہیں جو اپنے جلال اور شان وشوکت میں اپنی مثال آپ تھے۔ اسی طرح سے باقی صحابہؓ وقرونِ اولیٰ کے اکابرینؒ کی بھی یہی روش رہی ہے کہ حق بات کو پانے کے بعد اپنی مخالف رائے سے فی الفور رجوع کرنا، جن کی کئی ایک مثالیں احادیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ حتیٰ کہ علمی وعملی لحاظ سے گراں قدر خدمات دنیاے انسانیت کے حق میں انجام دینے کے بعد بھی اِن حق گو اللہ کے بندوں نے آخر میں یہ کہا کہ ہماری ذاتی رائے کے مقابلے میں اگر آپ کو کوئی بھی بات کتاب وسنت کے خلاف معلوم ہو تو ہماری رائے کو دیوار پر دے مارنا۔ خیال رہے کہ یہ کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُن کا چیلنج نہیں تھا کہ ہماری بات کبھی غلط نہیں ہوسکتی بلکہ یہ اُن کی اپنی آخرت کی فکر تھی۔ اسی لیے پوری نیک نیتی کے ساتھ اپنی غیر معصومیت کا اعتراف کرتے ہوئے حق تلاش کرنے کی راہوں کے دروازے اہلِ علم کے لیے ہمیشہ کھلے چھوڑ دینا اُن کو مطلوب تھا اور یہی اِن عظیم انسانوں کے حق گو ہونے کی واضح دلیل ہے۔

قرآن کا طرزِ استدلال

قرآن پاک کا مرکزی موضوع جیسا کہ انسان ہی ہے، وہ انسان سے براہِ راست یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ تم میری بات مان لو، بلکہ اس سے اسی کی فہمایش کے مطابق اُن باتوں کی طرف توجہ دلاتا ہے جو کہ وہ پہلے ہی سے جانتا ہو۔ توجہ دلانے کے بعد وہ اُن باتوں کے متعلق اُس سے سوالات پوچھتا ہے۔ سوالات ایسے ہوتے ہیں جو انسان کی عقل کو اپیل کرتے ہیں۔ انسان چاہے جواب دے یا نہ دے لیکن اس کی عقل کی سطح کے مطابق انسان خود ہی جوابات اخذ کر لیتا ہے۔ اُن اخذ کردہ باتوں سے وہ اس سے بڑے شفیقانہ انداز میں اپنی اصل بات کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ نبوت کے بعد تیرہ سال مکہ میں قیام کیا۔ اس دوران آپؐ نے دین کے بنیادی عقائد کو سمجھانے کے حوالے سے جو طرزِ استدلال اختیار کیا اور جس کو قرآن نے عمومی طور پر مکی سورتوں میں بیان کیا، وہ یہی تھا کہ انسانی عقل کے دریچوں کو پہلے ہی سے اخذ کردہ علم سے کھول دیا جائے۔

مثال کے طور پر ایک جگہ فرمایا کہ: ''اچھا، تو کیا انھوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا، اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے۔ اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ جمائے اور اُس کے اندر ہر طرح کی خوش منظر نباتات اُگا دیں۔ یہ ساری چیزیں آنکھیں کھولنے والی اور سبق دینے والی ہیں ہر اُس بندے کے لیے جو حق کی طرف رجوع کرنے والا ہو'' (قٓ ۵۰:۸)۔ سورۂ عنکبوت میں اس چیز کو بالکل ہی واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ وہاں پر حق سے منہ موڑنے اور دہرا معیار اختیار کرنے والوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ: ''اچھا تو جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے ایمان و یقین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے، اس سے دعا مانگتے ہیں۔ پھر جب وہ انھیں بہ صحت و سلامت خشکی پر پہنچا تا ہے تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

...بلکہ یہ لوگ شرک کرنے لگتے ہیں'' (العنکبوت ۲۹: ۱۰۴)۔ کبھی وہ انسان کو تواریخ کی طرف نظر دوڑانے کے لیے کہتا ہے، کہ شاید وہ حق کی طرف رجوع کرے۔ کبھی وہ زمان و مکان کی گواہی پیش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ فرمایا کہ: ''اے نبیؐ، اگر یہ لوگ تمھیں جھٹلاتے ہیں، تو ان سے پہلے قومِ نوحؑ اور عادؑ اور ثمودؑ اور قومِ ابراہیمؑ اور قومِ لوطؑ اور اہلِ مدین بھی جھٹلا چکے ہیں اور موسیٰؑ کی قوم بھی جھٹلا چکی ہے۔ ان سب منکرین کو ہم نے پہلے مہلت دی، پھر پکڑ لیا'' (الحج ۲۲: ۴۴)۔ ایک اور جگہ فرمایا کہ: ''قسم ہے زمانے کی (یعنی زمانہ گواہ ہے)، کہ انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لے آئے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے''۔ (العصر ۱۰۳: ۱-۳)

حصولِ علم کے اصول و ضوابط

قرآن پاک کے مطالعے کا یہ پہلا ہی اصول ہے کہ انسان اپنے ذہن کی تمام پراگندگی کو دُور کر کے آئے، کھلے ذہن کے ساتھ کسی پیشگی مفروضے (Pre-conceived Assumptions) کے بغیر اس نسخے کو ہاتھ لگائے۔ اس طرح سے انسان کو ایک مثبت سوچ (Positive Thinking) کے ساتھ قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ اصول نہ صرف قرآن کے ساتھ وابستہ ہے بلکہ علم کے باقی تمام ذخائر کی تہہ تک جانے میں بھی کارگر ثابت ہوا ہے۔ انسان کے علم حاصل کرنے کی پیاس جب تک نہ بجھے، اُس سے کلام جاری رکھنا چاہیے۔ لیکن اگر انسان اپنی عقل کے دریچے خود ہی بند کر دے یا اپنے موقف کو لے کر کٹ حجتی سے کام لے، اس سے پھر مزید بات کرنا آسمان کی طرف منہ کر کے تھوک دینے کے مترادف ہے۔ انھی جیسے انسانوں کے متعلق فرمایا گیا کہ: ''یہ لوگ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، یہ اب پلٹنے والے نہیں ہیں'' (البقرہ ۲: ۱۸)۔ اس کے بعد کس انسان کو یہ اختیار ہے کہ جبر کر کے ایسے لوگوں کو حق کی طرف مائل کرے، کیوں کہ فرمایا گیا کہ: ''اچھا تو اے نبیؐ، نصیحت کیے جاؤ، تم بس نصیحت ہی کرنے والے ہو، کچھ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہو'' (الغاشیہ ۸۸: ۲۲-۲۱)۔ ایسے انسان فطرت کے قوانین کا عذاب خود ہی چکھتے ہیں اور وقت انھیں جھوٹا ثابت کرنے میں کوئی تشنگی نہیں رکھتا۔

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ قرآن پاک کے کلمات سے بڑھ کر کوئی چیز سچ نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اِس کتاب کے طرزِ بیان کی اس دنیا میں اور کوئی نظیر نہیں۔ صدق وسچائی کا یہ منبع ہے۔ لیکن انسان کے ساتھ کلام کرنے میں اِس کتاب کا انداز انسانی ہی ہے، جس کی رُو سے یہ انسانی عقل کو اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کا بھرپور موقع فراہم کرتی ہے اور آخر میں جس چیز کی طرف رُخ کر کے یہ کتاب اتمامِ حجت کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر انسان کے پاس اس کتاب کے پیش کردہ دلائل کے مقابلے میں کوئی اور دلیل ہو تو اسے پیش کیا جائے۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ: ''اپنی دلیل پیش کرو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو''۔ (البقرہ ۲:۱۱۱، الاحقاف ۴۶:۴)

نبویؐ انقلاب کا منہج اور موجودہ صورتِ حال

دھونس، دباؤ، زور و زبردستی، کٹ حجتی یا جذبات کی بنیادوں پر لائی گئی تبدیلی کبھی دیرپا نہیں ہوتی۔ ایسی تدبیریں سماج میں نفرت و عداوتوں کے ماحول کو پنپنے کے سوا کچھ فراہم نہیں کرتیں۔ طاقت کی بنیاد پر لوگوں کو کچھ دیر کے لیے چپ کروایا جاسکتا ہے، لیکن ایسے سماج میں خروج و بدامنی کے بیج موجود رہتے ہیں اور جو کبھی بھی موافق ماحول پا کر سر نکال سکتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس عظیم انقلاب کو برپا کیا، اُس میں سیاسی و معاشی حکمت عملی کے ساتھ ساتھ علمی مواد (Intellectual Appeal) بھی بدرجہ اُتم موجود تھا۔ گو کہ اسلام ہی لوگوں کی اصل کامیابی کا واحد ضامن ہے، لیکن باوجود اس کے آپؐ نے اسلامی انقلاب کو لوگوں پر نہیں تھوپا۔ لوگوں کو پہلے اس سطح پر پہنچانا کہ وہ سمجھ سکیں کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، اسلام اُن سے کیا مطالبہ کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے، اصل کامیابی کیا ہے اور دنیا کا لہو ولہب ہونا اپنے اندر کیا معنیٰ رکھتا ہے، حسنات اور سیأت کے مابین کیوں کر اتنا بڑا فرق ہے ـــــ اُس کے بعد ہی اسلامی انقلاب کی تیاری کرنی ہوگی، بلکہ ایسی تیاری کرنے کے بعد لوگ بذاتِ خود اسلام کی ترویج وتلقین کی دعوت اپنے آپ دینا شروع کریں گے۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ کسی بچے یا کسی بدمست انسان کے ہاتھ پیسوں کی ایک تھیلی تھما دی جائے اور اس سے کہا جائے کہ جا! خوب ترقی کرو۔ لیکن کیا اس سے وہ بچہ ترقی کرے گا جسے پیسوں کی تھیلی کیا، ایک روپیہ کی اہمیت کا بھی ادراک نہیں ہے۔ لوگوں کو اس طرح سے ترقی کی طرف بلانے کا مقصد سماج میں بدامنی وانتشار پیدا کرنے کے مترادف ہے۔

انسان کو چاہے مادی اعتبار سے ترقی کرنی ہو یا روحانی اعتبار سے بلندیوں کو چھونا مقصود ہو،

© rasailojaraid.com